ٹِکٹ چیکر

محمد جمیل اختر

مکان نمبر DPN 123/B، اسٹریٹ #4، ڈھوک پونو، صادق آباد، راولپنڈی

پینتیس سال ٹرین میں سفر کر کر کے وہ تھک گیا تھا۔ وہ جب مڑ کر اپنی زندگی کے گزرے سالوں کی جانب دیکھتا تو اُسے سوائے سفر کے کچھ دکھائی نہ دیتا حالانکہ اِن گزرے سالوں میں اُس کی زندگی میں کیا کیا نہ ہوا تھا۔ شادی ہوئی، پانچ بچے ہوئے پھر وہ وقت بھی آیا کہ بچوں کی شادیاں بھی ہوگئیں، لیکن وہ مُڑ کر دیکھتا تھا تو سوائے سفر کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ گزشتہ پینتیس سال سے ریلوے میں ٹکٹ چیکر کی نوکری کر رہا تھا اور یہ سال اُس کی نوکری کا آخری سال تھا۔ اگلے سال اُس کو ساٹھ سال کا ہو کر ریٹائر ہونا تھا۔

بچپن میں اُسے ٹرین کی آواز سے محبت سی ہوگئی تھی۔ وہ مسجد میں سپارہ پڑھنے کے بعد شیشم کے بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرتا اور جب وہ پاس سے گُزرتی تو وہ مسافروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتا تھا۔ وہ سوچتا کہ کاش وہ بھی اِن مسافروں کے ساتھ سفر کر سکے۔

بچپن کی یہ محبت وقت کے ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ اُس نے بہت شوق سے ریلوے میں نوکری کی تھی اور ٹرین سے یہ عشق بھی برقرار تھا۔ جن مسافروں کو وہ بچپن میں ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتا تھا اب وہ اُن کے ساتھ سفر کرنے لگا تھا۔

زندگی ایک سفر ہے، لیکن اُس نے تو سچ میں اِس سفر کو سفر میں کاٹ دیا تھا۔ اُسے پہلے تو کبھی ایسا احساس نہیں ہوا تھا، لیکن کچھ مہینے پہلے جب اِس کی بیوی نے اُسے ملتان بیٹی کے ہاں جانے کا کہا تو اُس نے بتایا کہ اُس کی تو لاہور سے کوئٹہ جانے والی ٹرین میں ڈیوٹی ہے سو وہ نہیں جا سکتا تو اُس کی بیوی نے اُسے کہا کہ تم نے ساری زندگی سفر میں گزار دی ہے۔ اُس نے بیوی کی اِس بات کو نظر انداز کیا اور ڈیوٹی پر چلا گیا، لیکن وہ بات اُس کے لاشعور میں کہیں چِپک کر رہ گئی، معلوم نہیں کیوں بعض اوقات بظاہر بہت چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کے دل و دماغ پر بہت گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہیں، ٹرین میں بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے گزشتہ پینتیس سال کی نوکری پر نظر دوڑائی تو وہاں سفر ہی سفر تھا جہاں مسافروں کی طرف سے یہ جملے تواتر سے سننے کو مل رہے تھے:

''بابو یہ ملتان جنکشن کب آئے گا؟''

''یہ ٹرین کیوں رک گئی ہے کیا کوئی کراس ہے یا سگنل ڈاؤن ہے؟''

''بابو میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ میں دراصل بھاگتے ہوئے ٹرین میں سوار ہوا ہوں سو ٹکٹ نہیں خرید سکا مجھے ٹکٹ بنا دیں پر جرمانہ نہ کریں'' اور وہ جرمانہ نہ کرتا بس مسافر کو سمجھا دیتا کہ آئندہ احتیاط کرے۔

واقعی یہ جملے اُس کی زندگی میں کتنے زیادہ استعمال ہوئے تھے اُس کو اب احساس ہوا۔

اب وہ ہر روز نہ چاہتے ہوئے بھی یہی سوچتا رہتا کہ اُس کی ساری زندگی ٹرین میں گزر گئی ہے اور وہ زندگی کا اُس طرح لطف نہیں لے سکا جیسا وہ اپنے اردگرد لوگوں کو لطف اندوز ہوتے دیکھتا تھا۔ وہ کبھی بھی اپنی ڈیوٹی سے جی نہیں چراتا تھا کیونکہ اُسے اپنے کام اور ٹرین سے محبت تھی، وہ اب بھی عمر کے اِس حصے میں ٹرین کی آواز سنتا تو اُس کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی، لیکن اب اُس کا اپنے کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا جلد از جلد کام ختم ہو اور وہ گھر جائے۔ کراچی اور کوئٹہ کی وہ طویل مسافتیں جو پچھلے پینتیس سال سے بلا کسی حیل و حجت کے آرام سے کٹ رہی تھیں اب ایک بوجھ بن گئی تھیں۔ وہ کوشش کرتا کہ وہ اب ان طویل راستوں پر سفر نہ کرے۔ اُس نے دو ایک بار اپنے افسر سے بات بھی کی کہ اب اُس کی صحت اتنے طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر ممکن ہو تو اُسے اتنے طویل سفر پر نہ بھیجا جائے۔ اب وہ مسافروں سے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے نہیں ملتا تھا اور بغیر ٹکٹ کے ہر مسافر کو وہ جرمانہ ضرور کرتا۔

''یہ کیا زندگی ہوئی کہ ٹرین ہی میں کٹ گئی'' دن رات یہ سوال اُس کے دل و دماغ پر دستک دیتا رہتا تھا اور وہ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے وہ واقعات یاد کرتا کہ جب زندگی نے اُسے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا، لیکن وہ منہ موڑ کر ٹرین میں آ بیٹھا۔ اُسے یاد آیا کہ جب اُس کے بڑے بیٹے کی پہلی سالگرہ تھی تو اُس کی بیوی نے کتنے مہمانوں کی دعوت کی تھی، اُس نے جلدی جلدی کیک اور کھانے پینے کی دوسری اشیا بازار سے خرید کر بیوی کے حوالے کی تھیں کیونکہ اُسے دوپہر دو بجے ملتان جانے والی ٹرین میں ڈیوٹی دینا تھی اُس کی بیوی کتنا ناراض ہوئی تھی کہ وہ چھٹی کیوں نہیں کر لیتا، لیکن اُس نے چھٹی نہیں کی اور ملتان چلا گیا..... اُسے ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ایک اداسی نے آن گھیرا کاش وہ اُس دن اتنا اداس ہوتا اور گھر پر رُک جاتا۔

معلوم نہیں وہ کون سے سال کی اکتیس مارچ تھی جب بچوں کا نتیجہ آنا تھا اُس روز بھی وہ ٹرین میں کسی شہر جا رہا تھا۔ جب وہ اگلے دن واپس آیا تو اُسے معلوم ہوا

کہ اُس کے تین بچوں نے اپنی اپنی جماعت میں پہلی پوزیشن لی ہے اور اُس کی بیوی نے اُسے بتایا کہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس نے اُسے اسٹیج پر بُلا کر بچوں کی بہت تعریف کی۔ آپ کے بارے میں بھی پوچھا کہ آپ کیوں نہیں آئے، میں نے انہیں بتایا کہ آپ ڈیوٹی پر ہیں تو ہیڈ مسٹریس نے کہا کہ آج کے دن بھی ڈیوٹی؟

بیوی کی زبانی سنے ہیڈ مسٹریس کے ان الفاظ نے اتنے سالوں بعد اُسے پریشان کر دیا۔ کاش وہ اُس دن ڈیوٹی پر نہ جاتا اور بچوں کی خوشی میں خوش ہو لیتا۔

اُس نے بچوں کی شادی کے دنوں کو یاد کیا جو اُس نے بھاگتے دوڑتے کی تھیں۔ اُس نے ساری زندگی کتنی محنت کی تھی اور ایک ایک روپیہ بچا کر رکھا تھا اپنے بچوں کے لیے اور جب اُس روپے کو خرچ کرنے کا وقت آیا تو اُس نے خوب روپے لٹائے، لیکن خود معلوم نہیں وہ کہاں تھا ہر بچے کی شادی میں اُس نے چھٹی کی، لیکن اُس کے لاشعور میں یہی چلتا رہا کہ ۱۳ اپ اور ۴۱ ڈاؤن معلوم نہیں اس وقت کہاں ہوں گی.....

اُس نے اور بہت سے واقعات یاد کیے جب وہ اُس موقع پر تھا، لیکن وہ وہاں نہیں تھا یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ بعض اوقات انسان جہاں ہوتا ہے حقیقت میں وہاں نہیں ہوتا..... اُسے اب یقین ہو گیا کہ گزشتہ پینتیس سال اُس نے کہیں بھی گزارے تھے وہ دراصل ٹرین ہی میں تھا اُسے لگا کہ وہ ٹرین سے باہر کبھی گیا ہی نہیں اصل زندگی ٹرین ہے اور ٹرین سے باہر ایک خیال.....

یہ خیالات اُس کے لیے وحشت ناک تھے، لیکن وہ خوش تھا کہ بس چھ مہینے بعد ہی وہ ریٹائر ہو جائے گا اور پھر وہ خوش وخرم زندگی گزارے گا۔ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے بڑے بیٹے کے پاس مری چلا جائے گا اور وہاں پہاڑوں پر حسین موسم کا اور نظاروں کا لطف لے گا۔ بہت سی کتابیں جو وقت نہ ملنے کی وجہ سے وہ نہ پڑھ سکا وہ پڑھے گا، اُس کا چھوٹا بیٹا ملتان میں رہتا تھا وہ کچھ روز کے لیے وہاں چلا جائے گا، روز صبح سیر کو جائے گا اور اِس طرح کے لاتعداد پروگرامز جواب وہ دن رات سوچتا رہتا تھا۔

پھر وہ دن آ گیا جب وہ ریٹائرڈ ہو گیا۔ اُسے ایسا لگا کہ اُس کے کندھوں سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ وہ جب آخری بار اسٹیشن سے واپس گھر جانے لگا اور اُس نے مڑ کر ٹرین کی جانب دیکھا تو معلوم نہیں اُسے کیا ہوا کہ وہ رونے لگا جیسے کوئی برسوں پرانے محبوب سے بچھڑ رہا ہو۔ وہ یہ سوچ کر بے انتہا افسردہ ہو گیا کہ اب وہ کبھی بھی ٹرین کی آواز نہ سن سکے گا وہ آواز کہ جس کے ساتھ وہ بچپن سے محبت کرتا آیا ہے اور ٹرین سے جڑی ساری باتیں اب خیال بن کر بکھر جائیں گی لیکن اُس نے خود کو سمجھایا کہ اب یہ اُس کی آزادی کے دن ہیں اور اُسے خوش ہونا چاہیے۔

گھر آ کر اُس نے باری باری اپنے سب بچوں کو فون کیا کہ اب اُسے فرصت ہی فرصت ہے سو وہ بہت جلد اُن کے پاس آئے گا اُس نے بیوی سے کہا کہ وہ آج خوب گھوڑے بیچ کر سوئے گا کہ اُسے اب کوئی رات کی ڈیوٹی نہیں کرنی۔ بلاشبہ یہ تبدیلی اُس کے لیے ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔

وہ اب رات کو چین سے سویا کرتا تھا، لیکن ہفتے میں ایک دو بار وہ رات کو اٹھتا اور یونیفارم پہن کر ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ بیوی کو جگاتا اور کہتا ''دروازہ بند کر دو میں جا رہا ہوں'' اُس کی بیوی حیران ہو کر اُسے بتاتی کہ وہ تو اب ریٹائرڈ ہو چکا ہے تو تب وہ بہت شرمندہ ہوتا اور کہتا ''اوہ ہو مجھے تو یاد ہی نہیں رہا'' ایسا کئی بار ہوا تو اُس کی بیوی نے اُس سے کہا کہ وہ کچھ دن کے لیے چھوٹے بیٹے کے ہاں ملتان چلا جائے سو وہ ملتان چلا گیا۔ پہلی ہی رات وہ دو بجے نیند سے جاگ گیا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔ جب اُسے کچھ نہ ملا تو اُس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

''میری یونیفارم اور جوتے کہاں ہیں؟''

شور سُن کر اُس کا بیٹا اور بہو اپنے کمرے سے باہر آئے تو انہیں سمجھ نہ آئی کہ مسئلہ کیا ہے۔ جب انہوں نے اُسے بتایا کہ وہ اب نوکری نہیں کرتا تو وہ بہت دکھی ہو گیا ''آخر یہ مجھے یاد کیوں نہیں رہتا کہ میں نوکری نہیں کرتا؟'' اور اِس طرح کے واقعات اب مسلسل بڑھتے جا رہے تھے۔

وہ روز صبح گھر سے نکلتا اور ملتان اسٹیشن جا کر ایک بنچ پر بیٹھ جاتا اور گاڑیوں کو آتا جاتا دیکھتا رہتا۔ ہر ٹرین کے گزرتے مسافروں کو وہ ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتا اور اُسے ایسا لگتا کہ جیسے وہ اپنے گاؤں کا وہ چھوٹا سا لڑکا ہے جو سپارہ پڑھنے کے بعد درخت کے نیچے ٹرین کا انتظار کر رہا ہے تا کہ وہ مسافروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہہ سکے۔

انہی دنوں کی ایک گرم دوپہر کا قصہ ہے کہ اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے معلوم نہیں اُسے کیا سوجھی کہ وہ ایک ٹرین میں داخل ہو گیا اور مسافروں سے ٹکٹ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ لوگ اُسے حیرت سے دیکھنے لگے اور کچھ ہنسنے لگے۔

''کونسا ٹکٹ؟'' ایک مسافر نے پوچھا۔

''ریل میں کوئی بھی بغیر ٹکٹ کے سفر نہیں کر سکتا، بغیر ٹکٹ سفر کرنا جرم ہے سو ٹکٹ دکھایئے؟''

''تو تمہیں کیوں دکھائیں'' مسافر نے کہا۔

''مجھے نہیں دکھاؤ گے تو کسے دکھاؤ گے میں ہی تو ٹکٹ چیکر ہوں'' لوگ ہنسنے لگے۔ اسی دوران گاڑی میں موجود ٹکٹ چیکر آ گیا۔

''ہاں بھئی کیا مسئلہ ہے''

''یہ میری یونیفارم آپ کے پاس کیسے؟'' اُس نے ٹکٹ چیکر سے سوال کیا۔

''کیا ہو گیا ہے پاگل ہو گئے ہو، اپنا ٹکٹ دکھاؤ''

''میرا ٹکٹ؟ میرا کونسا ٹکٹ؟ میں تو خود ٹکٹ چیکر ہوں۔''

اور انھوں نے اُسے پاگل سمجھ کر ایک اسٹیشن پر اتار دیا۔ معلوم نہیں وہ کون سا شہر تھا کہ جس کی گلیوں میں وہ ''ٹکٹ، ٹکٹ'' پکارتا ہوا دوڑ رہا تھا... ○○